یادوں کا اُجالا

شکیل جمالی

یاد ہی دوست بھی ہے، یاد ہی جلاد بھی ہے
شکیل جمالی نے یاد کے ہر زخم کو
پھول کی طرح سجایا ہے۔ ابنِ صفی کے ساتھ
گزارا ہوا ہر لمحہ کتنا حسین، خوبصورت،
مہکتا ہوا زندگی کے اندھیرے میں اُجالوں
کا پیغام بر ہے ——

زندگی کی ہر سانس کے ساتھ چپکے سے ایک لمحہ گذر جاتا ہے اور اُس وقت یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ابھی ابھی جو لمحہ گذرا ہے وہ کتنا اہم اور قیمتی تھا لیکن جب یہی لمحات وقت اور عہد میں بدل جاتے ہیں تب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اِن گذرے ہوئے لمحات کی تہہ میں کتنی داستانیں پوشیدہ ہیں، کتنے یادوں کے چراغ روشن ہیں، کتنے دل کی دھڑکنیں زندہ ہیں اور کتنی شخصیتوں کے نقش و نگار اُبھرے ہوئے ہیں ——

یہی لمحات تاریخ بنتے ہیں ـــــ یہی لمحات یادوں کی تابناک قندیلیں روشن کرتے ہیں اور یہی لمحات مستقبل کی رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

میں آج ان ہی گذرے ہوئے لمحوں کی وہ داستان سنانا چاہتا ہوں جس میں آپ اپنے محبوب مصنّف اور سرّی ادب کی عظیم شخصیت ابن صفی کو اُن کے خدوخال اور پس منظر کے ساتھ دیکھ سکیں گے۔ اب تک آپ ابن صفی کو محض اُن کی تحریروں کے پیکر میں دیکھتے رہے ہیں، اُن کے اندازِ بیان کی لطافتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں، اُن کے اسلوب کی رعنائیوں میں کھوئے رہے ہیں، ان کے قلم کی سحر کارانہ فضاؤں میں سانس لیتے رہے ہیں، اُن کے تخیّل کی بلند پروازیوں پر حیرت کرتے رہے ہیں، اُن کے تخلیق کردہ کرداروں کو زندگی کی شاہراہوں پر چلتے پھرتے دیکھتے رہے ہیں اور ان کے طنز کے نشتر اپنے دل پر محسوس کرتے رہے ہیں ـــــ لیکن آپ نے کبھی ابن صفی کو ان کی تحریروں کے اس پار خود ان کے وجود کو زندگی کی حقیقی راہوں سے گذرتے ہوئے نہیں دیکھا ـــ! آپ یہ کیسے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ عظیم شخصیت جس نے جاسوسی ناول نگاری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے کیسے کیسے صفات اور کمالات کی حامل اور کتنی قدآور ہے ـــــ!

میں آج اِسی لئے ماضی کے اُن گذرے ہوئے لمحوں کو آواز دے رہا ہوں جو اب ایک عہد میں بدل چکے ہیں تاکہ جب یہ لمحے واپس آئیں تو آپ ابن صفی کی حقیقی تصویر اُن لمحوں کے آئینے میں دیکھ سکیں۔

اِس داستان کا آغاز اُس دور سے شروع ہوتا ہے جب ابن صفی صرف "اسرار احمد ناروی" تھے۔ ان کی شخصیت کیسے کیسے پہلو بدلتی ہے اور کن منازل سے گذرتی ہوئی ابن صفی تک پہنچتی ہے خود ایک دلچسپ داستان ہے۔ مگر یہ مکمل داستان مختصر سے صفحات میں نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ اس مضمون سے ابن صفی کا ایک واضح خاکہ ضرور آپ کے ذہن میں اُبھرے گا۔

۱۹۴۲ء کا پر آشوب زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے ہولناک شعلے مغرب سے مشرق تک پھیلے ہوئے تھے۔ بستیاں ویران ہو رہی تھیں۔ شہر تباہ ہو رہے تھے۔ عورتوں کا سہاگ سلگ رہا تھا۔ ماؤں کی گودیں سونی ہو رہی تھیں مگر ہٹلری جنون "اقتدار و ہوس کے نشے میں مدہوش ساری دنیا پر اپنی برتری مسلط کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

دوسری طرف غیر منقسم ہندوستان بھی جنگ کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ پورے ملک پر جنگ کی فضا چھائی ہوئی تھی اور اُسی کے ساتھ ساتھ "تحریک آزادی" بھی اپنے پورے شباب پر پہونچ چکی تھی۔ عوام حکومت برطانیہ کی سَو سالہ غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرف انقلاب کا نعرہ بلند ہو چکا تھا۔ پورے ملک میں جوش و خروش کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس جدوجہد آزادی میں کوئی پیچھے نہ تھا ہر محاذ پر لوگ لڑ رہے تھے۔ ادیب اور شاعر کے قلم بھی نوک سناں بن چکے تھے۔ اب لب و رخسار کے بجائے دار و رسن کے گیت گائے جا رہے تھے۔ بچے بچے کی زبان پر آزادی کا ترانہ تھا۔ اسی زمانے کی انقلابی نظموں میں سے ایک مشہور نظم کے چند اشعار ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں: ــــــــــ

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للّٰلہ نہ روکو جانے دو
وہ دیکھو اُفق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا مدفن
گر راہِ وفا میں کام آؤں سیندور سے مانگ بھرے رہنا
بندی نہ مٹانا ماتھے کی تم میری راہ تکے رہنا
میں خواب میں اکثر آؤں گا سینے میں اس کو رکھے رہنا
اب چھوڑ بھی دو میرا دامن للّٰلہ نہ روکو جانے دو

"اسرار ناروی" (ابن صفی) سے ملاقات ہونے کے کافی دنوں بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ مشہور انقلابی نظم اسرار ناروی نے اس وقت کہی تھی جب وہ ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول الہ آباد میں آٹھویں درجے کے طالب علم تھے۔

ہم لوگ اس زمانے میں الہ آباد کے ایک قدیم محلے "صمد آباد" میں رہتے تھے لیکن حالات کی بنا پر ہم نے وہ مکان تبدیل کر دیا تھا اور قریب ہی "حسن منزل" کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ ہمارے مکان کے بالکل سامنے کوارٹر نمبر ۱۵ - ۱۶ میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ تقریباً میری ہی عمر کا۔ دُبلا پتلا سانولا سا۔ مگر دیکھنے میں کافی اسمارٹ۔ عام طور سے چھوٹی مہری کا پائجامہ، کرتا اور شیروانی پہنتا تھا۔ کبھی کبھی پینٹ اور شرٹ میں بھی دیکھا جاتا تھا۔ لہردار بالوں میں ترچھی مانگ نظر آتی تھی اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی رہا کرتی تھی۔

میں اسے برابر دیکھتا تھا۔ کبھی بغل میں کتابیں دبائے ہوئے اسکول جاتے ہوئے کبھی دروازے سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتے ہوئے، کبھی بازار سے سامان لاتے ہوئے، کبھی ہاتھ میں دواؤں کی شیشیاں لئے ہوئے، کبھی اپنے کسی دوست سے سڑک پر باتیں کرتے ہوئے ــــــ ہم اس وقت تک ایک دوسرے سے باقاعدہ طور پر متعارف نہیں ہوئے تھے صرف اس کا نام جانتے تھے کیونکہ اس کے کوارٹر کے دروازے پر سفید چاک سے اس کا نام "اسرار ناروی" لکھا تھا ــــــ

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس کا یہ نام پڑھ کر چونک پڑا تھا کیونکہ یہ نام تو شاعروں جیسا لگ رہا تھا اور میں اُس وقت اُردو کے مشہور شاعر حضرت نوح ناروی کے نام سے اچھی طرح واقف تھا لیکن ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ تھا کہ حسن منزل میں کسی دوسرے "ناروی" کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ اور اسرار (ابن صفی) کو دیکھ کر یہ حیرت اور بڑھ گئی تھی کہ یہ حضرت کس طرف سے "ناروی" ہیں اِس چھوٹی سی عمر میں شاعر تو ہو نہیں سکتے پھر خواہ مخواہ اپنے نام کے آگے "ناروی" کا دُم چھلا کیوں لگا رکھا ہے۔ یہ تو کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ الہ آباد ضلع میں ایک

قصبہ ہے جس کا نام "نارہ" ہے اور اسرار کا وطن بھی نارہ ہے اسی تعلق سے انھوں نے بھی اپنے کو ناروی لکھنا شروع کر دیا تھا اور پھر یہ راز کھلا کہ اسرار نے ابتدائی عمر سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔

اسرار سے ہماری شناسائی دھیرے دھیرے بڑھتی رہتی اور اب مجھے اسرار کے بارے میں بڑی حد تک معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔

حسن منزل کے مکان میں اسرار اپنی والدہ اور چھوٹی بہن بلاغت کے ساتھ رہتے تھے کیونکہ ان کے والد صفی اللہ صرف ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا۔

حسن منزل میں آئے ہوئے مجھے کافی دن ہو چکے تھے۔ اسرار سے اب میری براہ راست گفتگو ہونے لگی تھی اور اس گفتگو کا آغاز کتابوں ہی سے ہوا تھا۔

ایک دن شام کو آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ گرمی اور حبس کی وجہ سے سانس لینے میں گھٹن سی محسوس ہو تی تھی۔ میں اپنے مکان سے نکل کر گیٹ پر کھڑا ہو گیا تھا کہ اتنے میں سامنے کوارٹر نمبر پندرہ کا دروازہ کھلا اور اسرار اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھے ——

"آج تو بڑی گرمی ہے ——!" اسرار میرے قریب پہونچ کر بولے۔

"جی ہاں ——!"

"میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس بہت ساری کتابیں ہیں۔ آپ کے والد صاحب دہیلر کمپنی میں منیجر ہیں۔ ان کے پاس تو اعزازی طور پر کافی کتابیں آتی ہوں گی"

"آپ نے صحیح سنا ہے ——" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ دو چار کتابیں مجھے پڑھنے کے لیے دے سکتے ہیں ——؟"

"ضرور —— مگر آپ کس طرح کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں ؟" میں نے سوال کیا۔

"اگر انگریزی کی جاسوسی ناولیں مل جائیں تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ ٹھوس اور سنجیدہ ادب

پڑھنے سے جب ذہن تھک جاتا ہے تو میں عام طور سے انگریزی کی جاسوسی ناولیں پڑھتا ہوں اُردو میں تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجموں کے علاوہ جاسوسی ناولیں لکھی ہی نہیں گئیں۔

"ہوں ——!" میں نے آہستہ سے کہا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ حضرت کچھ زیادہ ہی اُونچا اُڑ رہے ہیں۔ نویں درجے کے طالب علم ہیں اور انگریزی کی قابلیت کا رعب جما رہے ہیں —— اور دوسری طرف ٹھوس اور سنجیدہ ادب کے مطالعہ کا بھی تذکرہ فرما رہے ہیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر اسرار بولے۔

"اگر آپ کو کوئی زحمت ہو تو پھر رہنے دیجئے۔"

"نہیں —— نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے ——" میں یہ کہہ کر تیزی سے اپنے مکان کی طرف چلا گیا اور ابا کی الماری سے تین چار جاسوسی ناولیں نکال کر اسرار کے حوالے کر دیں۔

ہماری اور اسرار کی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا —— ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے —— قریب تر ہوتے گئے یہاں تک کہ اس کی پوری شخصیت میرے وجود پر چھا گئی تھی۔ ہم گھنٹوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے —— قہقہے لگاتے رہتے —— بحث و مباحثہ کرتے رہتے اور اب آہستہ آہستہ اس کی صلاحیتوں کے جوہر کھلنے لگے تھے۔

اسرار کے بارے میں میرا خیال غلط نکلا کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اپنی قابلیت کا رعب جماتا ہے اور کچھ زیادہ اُڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اپنی قوت پرواز سے بہت کم اُڑتا تھا۔ اس کے اندر خداداد صلاحیت تھی۔ اس کا مطالعہ بیحد وسیع تھا۔ وہ فطرتاً شاعر تھا۔ اس کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا تھا۔ وہ افسانے بھی لکھتا تھا جو کبھی کبھی ہفتہ وار "شاہد" بمبئی میں شائع بھی ہوتے تھے۔ اس کے مزاج میں بیحد ظرافت تھی مگر ظرافت میں طنز کے نشتر بھی چھپے رہتے تھے اور اس کا یہ جوہر تحریری طور پر اس وقت سامنے آیا جب ماہنامہ نکہت الہ آباد کے لیے اس نے پہلی طنزیہ کہانی "فراڈ" لکھی تھی۔ اسکے بعد "اختلاج نمبر"

"یادگار مشاعرہ" "شیطان صاحب" "میں اُس سے ملا" "نوکِ خار" وغیرہ اسرار کے بیحد مقبول طنزیہ مضامین ہیں۔

اسرار بیک وقت متعدد صلاحیتوں کے حامل تھے۔ اس کے بارے میں یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اسے شعر وادب کے علاوہ مصوری اور موسیقی سے بھی بیحد دلچسپی تھی۔ تمام مسودوں پر آج بھی اس کا بنایا ہوا پنسل اسکیچ اس کے فن مصوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ صرف شوق کی حد تک اس کو موسیقی سے دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ خود بھی بہت اچھا گاتا تھا۔ اس کی آواز کی مٹھاس آج بھی مجھے اپنے کانوں میں محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۴۹ء میں جب برادر محترم عباس حسینی صاحب نے ماہنامہ نکہت کی داغ بیل ڈالی تو ابتدا ہی سے ابن صفی ہماری ٹیم میں شامل ہو گئے ــــ اور پھر ۱۹۵۲ء تک باقاعدہ نکہت کے مدیر معاون رہے۔ غزلوں، نظموں اور کہانیوں کے علاوہ جب ابن صفی نے طغرل فرغان کے نام سے طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تو اس دور کے اہل نظر ان کی اس غیر معمولی صلاحیت پر چونک پڑے تھے۔

ابن صفی نے ایونگ کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا تھا اور ۱۹۴۷ء میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے الہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ بی۔ اے (سال اوّل) کے طالب علم تھے لیکن کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ الہ آباد یونی ورسٹی میں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور بعد میں انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔ اے کیا۔

ابن صفی کی تہہ دار شخصیت، مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں کی حامل تھی۔ شاعر، ادیب اور طنز نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر درس وتدریس کا بھی خاص ملکہ تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک یادگار حسینی اسکول میں ٹیچر تھے اور آج بھی یہ تعلیمی ادارہ ان کی زریں خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ ستائیس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی ابن صفی کی موت کی خبر سنتے ہی یادگار حسینی انٹر کالج نے ایک تعزیتی جلسے کے بعد اپنے سابق مدرس ابن صفی کے سوگ میں کالج بند کر دیا تھا۔

دنیا میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اس دنیا سے چلی جاتی ہیں تب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے لیے کتنی بڑی جگہ بنائی تھی اور ان کی شخصیت کتنی قد آور تھی —— ابن صفی کی ذات بھی ایسی ہی تھی۔ اُن کے چلے جانے سے نہ صرف ادبی دنیا میں زبردست خلا پیدا ہوا ہے بلکہ زندگی کے مختلف گوشوں میں سناٹا محسوس ہو رہا ہے۔

جاسوسی ناولوں کا سلسلہ ۱۹۵۲ء میں شروع ہوا تھا اور اسرار احمد ناروی ہر ماہ ایک ناول ابن صفی کے نام سے لکھنے لگے۔ اس سے قبل اُردو میں صرف تیرتھ رام فیروزپوری کے تراجم پائے جاتے تھے یا کچھ بزرگوں کے ناول' ان میں ظفر عمر مقبول تھے لیکن وہ بھی ان کا تخلیقی کارنامہ نہیں تھا بلکہ مارس لیبلانک کے چند ناولوں کو مقامی رنگ و روغن میں پیش کر دیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اُردو جاسوسی ناول نگاری میں ابن صفی ایک عہد کے موجد ہیں۔

پہلا ناول "دلیر مجرم" مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا تھا اور پڑھنے والے ابن صفی کے نئے دلکش اسلوب اور سحر انگیز انداز بیان پر چونک پڑے تھے۔ پھر تو ابن صفی کی صلاحیتوں کی روشنی بڑھتی ہی گئی —— پھیلتی ہی گئی ——

ابن صفی کے والد صفی اللہ مرحوم پہلے ہی سے کراچی میں مقیم تھے اسلئے ابن صفی کو بھی اگست ۱۹۵۲ء میں پاکستان ہجرت کرنا پڑی لیکن قلم کا جو رشتہ وہ اپنے وطن کی سرزمین پر قائم کر چکے تھے اس رشتے سے آخری وقت تک مخلص رہے اور ان کا قلم ملک و قوم کے بٹوارے کی طرح کسی حصے میں منقسم نہیں ہو سکا۔ ان کی نظریں حد بندی کی قائل نہیں تھیں —— وہ کسی مخصوص سماج اور معاشرے کو قانون کی عظمت و بزرگی کا احساس نہیں دلانا چاہتے تھے بلکہ ان کا پیغام دنیا میں پھیلے ہوئے تمام انسانوں کے لیے تھا اور یہی وجہ ہے کہ ابن صفی نے ہند و پاک میں بیک وقت مقبولیت اور شہرت کی وہ معراج حاصل کر لی جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔

پاکستان جانے کے بعد بھی لکھنے کا سلسلہ اسی پابندی کے ساتھ جاری رہا۔ البتہ ۱۹۶۰ء میں وہ اچانک نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئے اور مسلسل تین سال تک اس بیماری کی وجہ سے

ان کا قلم خاموش رہا۔ جاسوسی دنیا کے صفحات اپنے مصنف کے نئے شاہکار کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر یہ خاموشی ٹوٹی اور ۲۵ر نومبر ۱۹۶۳ء کو ابن صفی کا اعلان شدہ ناول "ڈیڑھ متوالے" بھرپور پبلسٹی اور پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ صرف ایک ہفتے میں اس ناول کا دوسرا ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آگیا۔

پہلے ایڈیشن کی رسمِ اجرا عظیم رہنما آنجہانی لال بہادر شاستری جی کے ہاتھوں ادارہ نکہت سے میں ہوئی تھی اور ایک ہفتے بعد دوسرے ایڈیشن کی رسمِ اجراء اس وقت کے صوبائی وزیرِ قانون عزت مآب علی ظہیر صاحب نے ادا کی تھی۔

قلم کا یہ عظیم سپاہی پھر میدان میں آگیا اور زندگی کی آخری سانسوں تک قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کا آخری شاہکار اتفاق سے "آخری آدمی" ہے جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

ابن صفی کراچی کے ایک ماہنامہ "نئے افق" کے مدیرِ اعلیٰ بھی تھے اور اسی ادارے سے ایک ماہنامہ "نیا رُخ" بھی ان کی نگرانی میں شائع ہونے والا تھا۔ چھ شمارے وہ اپنی نگرانی میں مرتب کرا چکے تھے اور اس کے لیے ایک خصوصی ناول "شمال کا فتنہ" بھی اپنی علالت کے آخری دنوں میں مکمل کر لیا تھا لیکن افسوس کہ ان کی زندگی میں اس کا کوئی شمارہ نہیں شائع ہو سکا تھا۔

ابن صفی صرف ایک بلند پایہ ادیب و شاعر نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہترین انسان، بہترین دوست اور انتہائی ذمہ دار، شریف اور وضعدار شخص تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر ہر وقت پھیلی ہوئی مُسکراہٹ اُن کے حُسنِ اخلاق کا اعلان کرتی تھی۔ ابن صفی کے سینے میں ایک ایسا دھڑکتا ہوا دل تھا جو ہر شخص کے دُکھ درد کو فوراً محسوس کر لیا کرتا تھا۔ نہ جانے کتنے نادار طالبعلموں کو وظائف دیتے تھے اور نہ جانے کتنے مجبور و بےکس انسانوں کی مدد کرتے تھے۔

ان کے الٰہ آباد کے بہت ہی خاص اور دیرینہ دوستوں میں ڈاکٹر مجاور حسین (ابن سعید) ڈاکٹر راہی معصوم رضا، اشتیاق حیدر، یوسف نقوی، سرور حسین، حمید قیصر، قمر جائسی اور

نازش پرتاب گڈھی ہیں۔

برادرم محترم عباس حسینی صاحب سے اُن کے جو تعلقات تھے اس کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ بس ان کا ایک جملہ یاد آرہا ہے جو اُنھوں نے "ڈیڑھ متوالے" کی اشاعت کے موقع پر اپنے پیغام میں افواہیں پھیلانے والوں کے سلسلے میں لکھا تھا ــــ "اُن بیچاروں کو شاید یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں۔

ابنِ صفی کی حیات کا افسانہ اتنا مختصر نہیں ہے کہ چند صفحات میں بیان کیا جاسکے اس کے لیے تو مجھے وقت دیجئے تب میں آپ کو گذرے ہوئے ترپن سال کے لمحات کی وہ کہانی سُنا سکتا ہوں جس میں ابن صفی اپنے پورے خدوخال کے ساتھ نظر آئیں گے اور ان کے دل کی دھڑکنیں آپ بہت قریب سے سُن سکیں گے۔ یہ تو محض ایک ہلکا سا خاکہ ہے۔

میرا دوست تو مجھ سے رخصت ہوگیا ہے لیکن اپنی یادوں کے ایسے اُجالے چھوڑ گیا ہے کہ میں ہمیشہ اسے دیکھتا رہوں گا ــــ اُس سے ملتا رہوں گا ــــ اُس کے قہقہے سُنتا رہوں گا ــــ اُس سے باتیں کرتا رہوں گا ــــ میرے لیے وہ زندہ ہے اور جب تک یہ اُجالے باقی رہیں گے وہ زندہ رہے گا ●●

جواھر پارے

" حدود اللہ میں رہ کر یقیناً انقلابی ہوں۔ اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہوسکتا کہ کوئی اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کرے۔ "

(زہریلا سیارہ)